نااہل حکمران ریاستیں تباہ کرڈالتے ہیں!

احمد شاہ بہادر‘ چودھواں مغل بادشاہ تھا۔ 29 اپریل 1748ء وہ بدقسمت دن تھا‘ جس روز دہلی کے تخت پر براجمان ہوا۔ احمد شاہ‘ محمد شاہ رنگیلے کا اکلوتا بیٹا تھا۔ قیامت یہ تھی کہ مسائل حکمرانی سے مکمل طور پر نابلد تھا۔ اس کی کسی قسم کی کوئی تربیت بھی نہیں تھی۔ یعنی بادشاہ بننے کی واحد وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ اپنے باپ کا واحد لڑکا تھا۔ اس کے علاوہ‘ کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ جسے امراءِ دہلی کا تاج پہنا سکتے۔ یہ فیصلہ بہت زیادہ ادنیٰ اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔ احمد شاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد‘ اپنے لئے‘ مجاہدالدین احمد شاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ کمال یہ بھی تھا کہ وہ اصول حرب سے ناواقف تھا۔ جس جنگ کو بنیاد بنا کر‘ اس نے اپنے لئے ''غازی'' کی کنیت استعمال کی‘ اس میدان کارزار میں احمد شاہ نے کوئی بھی کارنامہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ مگر وہ بادشاہ تھا۔ وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ دورِ ابتلا کی نشانی ہی یہی ہے کہ خواص‘ اپنا پرتو اور شان بڑھانے کے لئے‘ ہر کام کرسکتے ہیں۔ انسانی جلبت میں ہے کہ ہر انسان میں ''خبطِ عظمت'' برابر موجود ہے۔ احمد شاہ‘ کی والدہ قدسیہ بیگم نچلے سماجی طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ پیشہ کے لحاظ سے ایک ڈومنی تھی۔ شادی سے پہلے‘ وہ اور اس کا پورا خاندان‘ دہلی کی گلیوں میں ناچ گانے کا دھندا کرتا تھا۔ مگر آپ برصغیر کی پاور پالیٹکس کا سفلی پن دیکھئے کہ وہ عیاری کے ساتھ‘ محمد شاہ کے حرم میں داخل ہوئی۔ اور پھر ملکہ بن گئی۔ قدسیہ بیگم بادشاہ کی والدہ تھی اور اصل حکومت اسی کی تھی۔ اسے خواجہ سراؤں سے خاص لگاؤ تھا۔ لال قلعہ میں جاوید خان نامی خواجہ سرا کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ یعنی طوائف اور خواجہ سرا‘ دونوں مل کر پورے برصغیر پر دندناتے پھر رہے تھے۔ قدسیہ بیگم نے بذات خود اپنے لئے جو نام منتخب کیے تھے۔ وہ حد درجہ عالیشان تھے۔ ان القابات سے وہ اپنے احساس کمتری کو کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ صاحبہ اززمانی‘ حضرت قبلہ عالم‘ ممتاز محل اور نواب قدسیہ جیسے نام عظمت کے نشان‘ اپنے لئے استعمال کرواتی تھی۔ مگر نہ اس میں عظمت تھی اور نہ ہی کوئی توقیر۔ کج فہمی کا اندازہ لگایئے کہ 21 جنوری 1754ء کو اس کا یوم پیدائش منایا گیا۔ اس سالگرہ پر دو کروڑ روپے اپنی گرہ سے خرچ کیے۔ مگر اس اثناء میں‘ فوج کے سپاہی تنخواہ نہ ملنے پر ہنگامہ کر رہے تھے اور ان کی مجموعی تنخواہ صرف دو لاکھ روپے تھی۔ جو بادشاہ ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ یعنی خواص حد درجہ امیر تھے مگر سرکاری خزانہ خالی تھا۔ ویسے تمام تیسری دنیا کے ممالک میں ماضی میں یہی حالات تھے اور بدقسمتی دیکھئے کہ آج بھی وہی دگرگوں حالات ہیں۔ 1754ء میں بادشاہ فوج کی تنخواہ نہ دے پایا۔ مگر اس کی والدہ نے اپنی سالگرہ کی تقریبات پر دو کروڑ روپہ خرچ کر ڈالے۔ ویسے ہمارے بدقسمت خطے یعنی برصغیر میں یہ معاملہ صدیوں سے جوں کا توں ہے۔ قدسیہ بیگم دربار خود لگاتی تھی۔ امراء کو بلا کر احکامات صادر کرتی تھی۔ احمد شاہ کو کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ فرامین کب اور کیونکر جاری ہوئے ہیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ احمد شاہ کو فکر بھی نہیں تھی کہ اس کی والدہ اختیارات کا کس قدر غلط استعمال کر رہی ہے۔ گراوٹ کی انتہا دیکھئے۔ قدسیہ بیگم کے بھائی کا نام مان خان تھا۔ وہ زنانہ کپڑے پہن کر دلی کی گلیوں میں خواتین کے ساتھ ناچتا تھا۔ جب ہمشیرہ ملکہ بنی تو بھانجے نے اپنی والدہ کے کہنے پر‘ اسے ملاقادالدولہ بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ اور چھ ہزار سواروں پر منصب دار مقرر کر دیا۔ یعنی سب کچھ بادشاہ اور اس کی والدہ نے اپنے خاندان تک محدود کر لیا تھا۔ انعام واکرام‘ دولت‘ بلند بانگ خطابات اور نمود و نمائش سب کچھ ان سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہوتا تھا۔ احمد شاہ‘ چھ برس کے قریب برصغیر میں ہوس‘ لالچ اور کجکلاہی کا کھیل کھیلتا رہا۔ پھر وہی ہوا جو قدرت کے عظیم فیصلے ہوتے ہیں۔ عمادالملک جو کہ سابقہ وزیراعظم تھا اور احمد شاہ کا دشمن تھا۔ اس نے مرہٹوں کے پیشوا ملہار راؤ ہلکر کے ساتھ مل کر‘ بادشاہ اور اس کی والدہ کو گرفتار کیا۔ دونوں کی آنکھیں نکالی گئیں۔ اور انہیں سالم گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں دونوں اپنی موت تک قید رہے۔ ہندوستان کی دو ہزار سالہ تاریخ کو غور سے پڑھیے۔ اور اس کا غیر متعصب تجزیہ فرمایئے۔ آپ کو‘ کسی بھی دور میں قانون کی حکمرانی‘ انسانی حقوق اور مضبوط ادارے نظر نہیں آئیں گے۔ ایک امر تو یقینی ہے کہ برصغیر میں انتقال اقتدار کا کوئی درست اور صائب نظام نہیں بن پایا۔ انگریزوں کے ایک ڈیڑھ صدی کے دور میں بھی حکمران‘ کسی بھی طریقے سے‘ لوگوں کے جذبات کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔ یہ کہنا درست ہے کہ حکومت کرنے کا حق‘ ہمارے خطے میں ہمیشہ طاقت کے بل بوتے پر حاصل کیا گیا ہے۔ اور اس سیاسی جنگ کا سب سے بڑا اصول یہی ہے کہ اس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ 1947ء اور اس سے پہلے کے ستر برس کی تاریخ کی ورق گردانی‘ یہ ثابت کرتی ہے کہ آہستہ آہستہ عام لوگوں میں شعور کی سطح بلند ہو رہی تھی۔ جمہوریت کا پودا تمام تر مسائل کے باوجود پنپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں ان مقامی لوگوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے جو آزادی کی امنگ لئے‘ خطے کے لئے بہتر سہولتوں کے طلبگار تھے۔ اس آرزو کی تکمیل کے لئے‘ مختلف ادوار میں حد درجہ قربانیاں دی گئیں۔ سچ یہ بھی ہے کہ اس میں‘ ہندو‘ مسلمان اور سکھ بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ مذہب کا کسی قسم کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ میرٹھ چھاؤنی سے اٹھنے والی اس عظیم بغاوت میں مسلمان اور ہندو برابر کے شریک تھے۔ مگر جب انگریزوں نے یہ دیکھا کہ اگر یہ تمام لوگ متحد ہو گئے تو ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا اسے بے دریغ لوٹنا‘ ناممکن ہو جائے گا۔ اس وقت تاج برطانیہ کی ناک کے سائے تلے‘ دونوں مذاہب کے پیروکاروں میں نفرت کا بیج بویا گیا۔ یہ سب کچھ‘ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی تخت کی ایسی قبیح سازش تھی‘ جس میں وہ مکمل کامیاب رہے۔ ہندو اور مسلمان صدیوں سے آپس میں آرام سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں کبھی بھی فسادات نہیں ہوئے تھے۔ مگر انگریزوں نے کمال منافقت سے دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنا شروع کر دیا جو کہ ایک سماجی خلیج بن گیا۔ اور آج وہ خلیج‘ بڑھ کر ایک ایسا تیزابی سمندر بن گیا ہے جسے عبور کرنا اب کسی کے بس میں نہیں رہا۔

تقسیم ہند کے بعد‘ دونوں ممالک نے اکٹھا سفر شروع کیا۔ ہندوستان ایک لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوا‘ کہ آزادی کے عمل میں بذات خود شامل رہنے والے قائدین کو حکومت کرنے کا موقع ملا۔ نہرو‘ سولہ برس تک ہندوستان کا وزیراعظم رہا۔ اس نے وہاں‘ ریاستی ادارے بنانے پر کافی محنت کی۔ اس کی بدولت ہندوستان‘ جمہوریت کی پگڈنڈی پر چلتے چلتے‘ ایک مستحکم شاہراہ پر گامزن ہو گیا۔ جس میں کافی حد تک‘ ووٹ کے ذریعے‘ حق حکمرانی لوگوں تک پہنچتا رہا۔ مگر بدقسمتی دیکھئے‘ کہ پاکستان میں مسائل‘ قائد کے فوت ہونے سے‘ بگڑتے چلے گئے۔ غلام محمد‘ سکندر مرزا اور ایوب خان نے وہ مکروہ کھیل کھیلا۔ جس نے ملک میں فطری طور پر جمہوریت کے کمزور پودے پر محلاتی سازشوں کی مہلک آبیاری کر دی۔ ہمارا دورِ ابتلا‘ اسی وقت سے شروع ہو چکا تھا۔ جب یہ لوگ‘ عوام کو جوابدہ نہیں تھے مگر ملک کے حکمران تھے۔ یعنی انتقال اقتدار کا کوئی اصول ہم طے ہی نہیں کر پائے۔ بدحالی دیکھئے کہ غلام محمد فالج زدہ انسان تھا جو بول نہیں سکتا تھا۔ ہر وقت مونہہ سے تھوک کے فوارے چھوڑتا تھا۔ 1951ء سے 1955ء تک طاقتور ترین حکمران رہا۔ ہم نے مشرقی پاکستان کو اپنی ادنیٰ حکمت عملی سے گنوا دیا۔ مگر کوئی سبق حاصل نہ کر سکے۔ دیکھا جائے‘ تو ہم ملک میں کوئی ایسا مستحکم نظام کی اینٹ تک نہیں رکھ پائے‘ جس سے طاقتور اداروں کی سیاست میں عمل داری ختم کی جا سکے۔ تنزلی کا یہ سفر‘ کمزور اور ٹوڈی سیاست دانوں کی وجہ سے جاری و ساری رہا۔ اور ریاستی ادارے سیاست میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یحییٰ خان‘ ضیاء الحق‘ پرویز مشرف وہ مشکل لوگ تھے جو لوگوں کی بہتری کے نعرے لگاتے رہے۔ مگر ملک کو وہاں پہنچا دیا جہاں سے واپسی کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ ملک کو ایک ایسی جنگ میں دھکیل دیا جس کے شعلے ہمارے بہادر بچوں کو زندہ جلا رہی ہے۔ شہریوں کو روزانہ کی بنیاد پر شہید کیا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ ہر دور کا اپنا‘ احمد شاہ بہادر ہوتا ہے۔ دراصل‘ نااہل حکمران ریاستیں تباہ کر دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان سے کیسے بچا جائے۔